احتشام حسین کی تنقید: ناول کے حوالے سے

رئیس فاطمہ

CV3، سیکٹر۔23، راجندر نگر، غازی آباد (یوپی)

اُردو ناول سے متعلق احتشام حسین کے مضامین کی تعداد کم وبیش پانچ ہے۔ جن میں دو مضمون ''فسادات''، ''ناول کی تنقید'' بسیار تلاش کے باوجود دستیاب نہ ہوسکے۔ بقیہ تینوں مضامین، اُردو ناول پر مارکسزم کا اثر، اردو ناول اور سماجی شعور، خوجی ایک مطالعہ، سے ان کی فکری بصیرت اور فنی مہارت کا علم ہوتا ہے۔

مجموعی طور پر ان مضامین کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ احتشام حسین دو اہم پہلوؤں کو زیرِ بحث لاتے ہیں۔ سماجی حقیقت نگاری اور ٹائپ کردار کے مطالعہ کے طریق کار۔ احتشام حسین کے دو مضامین ''اردو ناول پر مارکسزم کا اثر'' اور ''اردو ناول اور سماجی شعور'' میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اردو ناولوں میں موضوعاتی ارتقا کس طرح ہوتا رہا۔ ان مضامین میں جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہو رہا ہے، صرف انہی ناولوں اور ناول نگاروں کا ذکر کیا گیا ہے جن میں سماجی حقیقت کسی نہ کسی صورت میں جلوہ گر ہے۔ احتشام حسین نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ''ناول اور لکھنے والے اسی حد تک زیرِ بحث آئیں گے جہاں تک وہ سماجی حقیقتوں کا اظہار کرتے ہیں اور لکھنے والے کی فنی بصیرت کا پتہ دیتے ہیں۔''

جہاں تک بات حقیقت نگاری کی ہے تو احتشام حسین کے تقریباً تمام مضامین میں حقیقت کا ذکر کسی نہ کسی صورت میں موجود ہوتا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا خیال ہے کہ ترقی پسند نقاد اشتراکی حقیقت نگاری کا واضح تصور نہیں رکھتے۔ حالانکہ احتشام حسین کے مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے سنجیدگی کے ساتھ سماجی حقیقت نگاری پر غور کیا ہے اور مختلف پہلوؤں سے حقیقت کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اپنے اکثر مضامین میں لکھا ہے کہ حقیقت بہرحال کسی نہ کسی صورت میں شعر وادب میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ ''حقیقت نگاری کی مختلف تعبیریں پیش کی گئی ہیں جن سے مختلف اور بعض اوقات متضاد نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اس لیے اس حقیقت پسندی کو جو مادی تصورِ تاریخ سے پیدا ہوتی ہے، دوسری طرح کے حقیقت نگاروں سے الگ اور ممتاز کرنے کے لیے اشتراکی یا سماجی تحریروں کی تجدید ضروری قرار پائی۔''

حقیقت کی تفہیم دراصل ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔ ہر دور کی اپنی حقیقتیں اور صداقتیں ہوتی ہیں پھر ان میں تبدیلیاں سماجی واقتصادی حالات کی بنیاد پر ہوتی رہتی ہیں۔ حقیقت کا مفہوم ہر دور میں مختلف رہا ہے آج بھی حقیقت ایک پیچیدہ مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ کوئی اسے سماج میں تلاش کر رہا ہے تو کوئی فرد میں۔ بہر حال اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ احتشام حسین نے حقیقت کی جتنی وضاحت سماجی نقطۂ نظر سے کی وہ اہمیت کی حامل ہے۔ ڈاکٹر خورشید احمد لکھتے ہیں:

> ''احتشام حسین نے جتنی وضاحت کردی، وہ کم نہیں۔ ان کی اہمیت یہ ہے کہ وہ اس سوال سے الجھے سماجی حقیقت نگاری ناول اور افسانہ کا معیار ٹھہری۔''

(احتشام حسین: ذکر وفکر مرتبہ ڈاکٹر نذیر احمد)

احتشام حسین نے حقیقت نگاری کی بنیاد مادی اصولوں پر رکھی۔ ان کا ماننا ہے کہ زندگی کی حقیقتیں دراصل سماج کے مادی تصادم اور کش مکش میں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ تصادم کی بنا پر قدریں بدلتی رہتی ہیں۔ بعض اوقات تبدیلیاں بہت جلد رونما ہوتی ہیں تو بعض دفعہ صدیاں لگ جاتی ہیں۔ تبدیلیاں بہرحال ہوتی ہیں۔ انہی تبدل واختلافات سے زندگی میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔ اس ضمن میں احتشام حسین لکھتے ہیں:

> ''مارکسزم کہتی ہے کہ زندگی کی رفتار خطِ مستقیم کی طرح سیدھی نہیں، اس میں مثبت اور منفی اثرات سے پیدا ہونے والی تبدیلیاں ہیں جو ایک ہی وقت میں اپنا عمل جاری رکھتی ہیں۔ اس طرح مخالف عناصر کے مسلسل تصادم سے نئی قدریں پیدا ہوتی ہیں۔''

ناول زندگی کے ان تمام پہلوؤں کو پیش کرتا ہے جن سے انسان دوچار ہوتا ہے۔ انسانی معاشرے کے ڈھانچے کو ہی کہانی کا موضوع بتایا جاتا ہے۔ زندگی کی پیچیدگیاں، اخلاقی قدریں، گناہ، ثواب، ہمدردی، محبت غرض تمام باتیں ناول میں پیش کی جاتی ہیں۔ یہاں ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ اخلاقی قدریں ہر دور میں بدلتی رہتی ہیں۔ ناول کی وسعتیں تمام تبدیلیوں کو اس کے عہد کے تقاضے کے مطابق پیش کرتی ہیں۔ ''یوں تو ہر صنف زندگی ہی کے کسی نہ کسی رخ کا جذباتی رنگ میں تجزیہ کرتی ہے لیکن ناول کو کئی حیثیتوں سے دوسری اصناف پر فوقیت حاصل ہے۔ یہ اصنافِ ادب میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ صنف ہے، اس کا خاکہ اتنا وسیع، اتنا مرکب، اتنا پیچیدہ اور پھر بھی

اتنا لطیف ہوتا ہے کہ اس میں سماج کا صرف ایک رخ نہیں، دو ایک افراد نہیں، دو چار موقع نہیں، کوئی چھوٹا سا تاثر نہیں بلکہ کبھی کبھی اس کا مکمل عکس دیکھا جاسکتا ہے۔ سماج کی پوری مشین کی حرکت ناول میں دیکھی اور دکھائی جاسکتی ہے۔'' ایک اور جگہ وہ ناول کی تعریف کچھ اس طرح کرتے ہیں:

''ناول ایک پیچیدہ سماج کا مظہر ہے۔''

ہندوستان میں غدر کے بعد ناول نے قدم رکھا۔ یہ وہ دور تھا جب انگریز ہندوستان میں اپنی حکومت مستحکم کر رہے تھے اور مسلمانوں کے عیش ونوش کے زوال کی ابتدا ہو چکی تھی۔ ہندوستان انگریزوں کے ظلم و جور کا شکار ہو رہا تھا۔ معاشرے کے حالات اب وہ نہیں رہے جن میں داستانیں فروغ پاتی تھیں۔ احتشام حسین اس دور کے متعلق لکھتے ہیں:

''یہ وہ عہد ہے جس میں جدید استحکام کی آخری اور زوال کی ابتدائی حدیں ملتی ہیں۔''

ادب نے بھی سماجی حالات کے مدِّ نظر کروٹ بدلی۔ ظاہر ہے کہ ادب کا وجود ادیب کی فکر و ذہن کی غمازی کرتا ہے۔ ادیب کے ذہن کو سماجی حالات ہی صیقل کرتے ہیں لہٰذا ادب نے ان تمام حالات اور حقائق کو خود میں جذب کرنے کی کوشش کی جو اس دور میں رونما ہو رہے تھے۔ احتشام حسین اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ دیگر زبانوں کے ادب کی مانند اردو میں بھی یوں تو کہانی کا وجود انسانی ارتقا کے ساتھ ہی ملتا ہے البتہ وہ قصّے جو ناول اور مختصر افسانے کہلاتے ہیں، ان کے مطالعے میں ہمیں سماج اور انسانی شعور میں تغیّر و ارتقا واضح طور پر نظر آتا ہے۔ آج کہانیوں میں پیچیدگیاں مزید بڑھ گئی ہیں لہٰذا ہم ناول کا مطالعہ کرتے ہیں تو سماجی شعور کا مطالعہ از خود ہو جاتا ہے۔

ناول کا وجود دراصل عہدِ سرمایہ داری کی پیداوار ہے۔ سائنس نے روایات کی پرکھ کی تو سماجی کش مکش میں اضافے کا علم ہوا۔ ایسی صورت میں انسان اور ان سے جڑے مسائل کے بہت سے پہلو سامنے آئے اور بہت سے پہلوؤں پر توجہ دینے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس لحاظ سے ناول کو بہتر سمجھا جانے لگا۔

''یورپ میں ناول نے شاعری اور ڈرامے جیسے اہم ادبی اصناف کو نیچا دکھا کر یا کم سے کم ان کی اونچی مسندوں سے انھیں ہٹا کر سب سے اہم ادبی فارم کی حیثیت اختیار کر لی اور ہر قسم کے سنجیدہ، فلسفیانہ، فکری اور گہرے خیالات کے اظہار کے لیے اس صنفِ ادب سے کام لیا جانے لگا۔''

احتشام حسین کے مطابق ناول عصری سماج کے مطالعہ کے لیے بعض دفعہ تاریخ پر فوقیت رکھتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اس کی تاریخی اہمیت سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ اس کی ادبی اہمیت کم ہے۔ البتہ دونوں ایک دوسرے میں مدغم ہیں۔

احتشام حسین نے ناول کے فن کے بجائے اس کے موضوعی ارتقا پر سماجی نقطۂ نظر سے گفتگو کی ہے۔ کوشش کی ہے کہ اس وقت تک لکھے گئے ناولوں میں سماجی اور مارکسی قدروں کی شناخت کر سکیں۔ انھوں نے فرائڈ کے خیالات سے بھی ناولوں میں شعور اور لاشعور کی حقیقت پر گفتگو کی ہے اور نفسیاتی حقیقت کو پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں احتشام حسین لکھتے ہیں:

''کئی ناولوں میں مارکسزم کے تجزیہ کے ساتھ نفسیاتی تجزیہ بھی شامل ہو گیا ہے۔ جہاں شعور و لاشعور کے تعلق کو خوبی سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ذہن کا آزاد تسلسل، اشارے اور خود توجہی، بھولی بسری یاد جدید ہندوستانی ناولوں میں پائے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی تو یہی باتیں مقصد اور موضوع بن جاتی ہیں اور کبھی کبھی کرداروں کے سمجھنے میں ان سے کام لیا جاتا ہے لیکن مقصد کچھ اور ہوتا ہے۔''

یہاں پر یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ سائنٹفک نقطۂ نظر ہر اس نظریۂ نقد سے استفادہ کرتا ہے جو ادب کی پرکھ میں کارگر ہوں۔ احتشام حسین فرائڈ کے نظریات کے منکر نہیں ہیں لیکن وہ ان نظریات کی افادیت کے اسی حد تک قائل ہیں جس حد تک وہ تفہیم ادب میں کارآمد ہوتے ہیں۔ مندرجہ بالا اقتباس میں انھوں نے اپنے اس احساس کا اظہار کیا ہے کہ کبھی کبھی اس نظریہ سے کرداروں کو سمجھنے کا کام لیا جاتا ہے اور کبھی یہی باتیں مقصد اور موضوع بن جاتی ہیں۔ جب تک یہ باتیں کرداروں کے سمجھنے میں کارآمد ہوتی ہیں ان کے مطابق وہ نقطۂ نظر سے منحرف نہیں ہوتی اور مقصد برقرار رہتا ہے دوسری صورت میں جبکہ یہ موضوع قرار پاتی ہیں تو کہانی کو مبہم اور مقصد سے منحرف کر دیتی ہیں۔

اُردو ناول نگاری کے ارتقا پر روشنی ڈالتے ہوئے احتشام حسین نے نذیر احمد کے ناولوں کا ذکر کیا ہے۔ نذیر احمد نے سماج کے مختلف مسائل کو اپنی کہانیوں میں پیش کیا۔ نذیر احمد نے اپنی کہانیوں میں سماج کی مادی اور نفسیاتی حقیقتوں کو پیش کیا ہے خاص کر ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے مسلمانوں کی زندگی میں جو تغیّرات اور ان کی بندھی ٹکی زندگی میں جو انتشار برپا کیا تھا، جاگیردارانہ عہد کی وہ قدریں جو ان حالات میں خوبی کے بجائے عیب معلوم ہو رہی تھیں ان تمام مسائل کو انھوں نے بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ شاہجہاں اور محمد شاہ رنگیلا کے دور کی زوال شدہ دلی کی صورتِ حال یہ تمام نذیر احمد نے اپنی کہانیوں میں پیش کیا ہے۔ ''اس دور کے لوگوں میں نہ تو نئی تعلیم سے پوری طرح ٹکر لینے کا حوصلہ ہے اور نہ اسے نظر انداز کرنے کی ہمت، نہ مذہب کو محض عقیدے کے قلعے میں بند رکھنے میں آسودگی ہے نہ اس کو عقل اور سائنس کی کسوٹی پر پرکھنے کی جرأت۔''

احتشام حسین نے مختصراً نذیر احمد کے ناولوں کا موضوعاتی جائزہ لیا ہے۔

اور پھر ہر ناول کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں سماج کے اہم مسائل کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے نذیر احمد کے پہلے ناول نگار ہونے اور ان کے ناول میں عصری اور معاشرتی شعور کی نشاندہی کی ہے۔ ساتھ ہی اس بات کا گلہ بھی کیا ہے کہ نقادوں نے نذیر احمد کے ناولوں میں حقائق کا کما حقہ، جائزہ نہیں لیا ہے۔

نذیر احمد کے ناولوں کے ذکر کے بعد احتشام حسین سرشار کے ناولوں پر تبصرہ کرتے ہیں۔ جب وہ فسانۂ آزاد پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں تو اس پورے قصّے میں انھیں خوجی کا کردار متاثر کرتا ہے۔ ان کا مضمون ''خوجی ایک مطالعہ'' ٹائپ کرداروں کے تنقیدی تجزیے کا بہترین نمونہ ہے۔

خوجی فسانۂ آزاد کا ایک اہم کردار ہے جو زوالِ اودھ کی پیداوار ہے۔ فسانۂ آزاد کے سلسلے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ ناول ہے یا داستان البتہ احتشام حسین نے اسے داستان اور ناول کے درمیان کی کڑی قرار دیا ہے۔ جس کی وجہ وہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''ناول جس صنعتی دور میں پیدا ہوا۔ جس میں اس نے جاگیرداری دور میں لکھی جانے والی داستانوں سے علاحدگی اختیار کی، اس کا پورا شعور سرشار کو نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ فسانۂ آزاد ناول اور داستان کے درمیان کی ایک چیز بن کر رہ گئی ہے۔''

فسانۂ آزاد دراصل لکھنوی تہذیب اور اس کے ماحول کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ یوسف سرمست اس سلسلے میں رقمطراز ہیں:

> ''انھوں نے [یعنی سرشار نے] صرف لکھنؤ کے معاشرے اور اس کی زندگی کو پیش کیا ہے لیکن اس معاشرے کی یہ ایسی مکمل اور جامع تصویر ہے کہ اس میں ہر پہلو ملتا ہے ہر جذبہ ملتا ہے۔''

احتشام حسین 'فسانۂ آزاد' کے متعلق اس طرح لکھتے ہیں:

> ''وہ جس دنیا کے مصور اور ترجمان ہیں وہ بھی ایک زوال آمادہ سماج کی دنیا ہے جس کے بیماران پر مرنے والے بڑی تعداد میں موجود ہیں۔''

اگرچہ یہ زوال کا زمانہ تھا لیکن لکھنؤ کے ماحول میں نوابی روایتوں کے علاوہ شرافت و اخلاق کی قدریں، علم و فضل کے ساتھ رنگینی وغیرہ اور اسی طرح کے دیگر تضادات کسی نہ کسی صورت میں موجود تھے۔ ''غیر معمولی ہیبت کے ساتھ دعوتِ چشم و گوش کا سامان، شاعری فن پرستی، تکلفات اور عیش پرستی روایت کی پابندی اور جدت پسندی، پرانی روشیں اور نئے تقاضے۔ کتنے عناصر یکجا ہو گئے تھے جن کی کیفیت اور کمیت تغیرات کی زد پر غیر محفوظ شکل میں معرضِ امتحان میں تھی اور سرشار کی فن کارانہ نگاہ ان کے مختلف پہلوؤں کو دیکھ رہی تھی۔'' لکھنوی معاشرے کی یہ تمام کیفیات سرشار نے اپنے قصے میں پیش کی ہیں۔ ناول ''فسانۂ آزاد'' بلاشبہ سرشار کا اہم کارنامہ ہے لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ فنی لحاظ سے ان میں بہت سی خامیاں ہیں۔ طوالت اور کمزور پلاٹ، افسانہ در افسانہ یہ تمام خصوصیات داستانوں کی ہیں۔ کہانی کا پلاٹ بے ترتیب اور پیچیدہ ہے۔ البتہ قصے میں زندگی کا احساس ہے اور یہی زندگی اس قصے کی قدر میں اضافہ کرتی ہے۔ ''بظاہر ان کی ناول نگاری بے مقصد نظر آتی ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ بات سمجھنا مشکل نہیں رہ جاتا کہ وہ کن قدروں کو محض رسمی سمجھتے تھے اور کن میں انھیں زندگی کی جھلک ملتی تھی۔''

احتشام حسین کے نزدیک ''خوجی'' کا کردار لافانی ہے۔ انھوں نے مضمون ''خوجی ایک مطالعہ'' کی ابتدا میں ہی لکھا ہے کہ اُردو ناول میں بہت کم ایسے کردار ہیں جو زندۂ جاوید ہیں۔ لافانی کردار کے متعلق ان کا خیال ہے کہ:

۱۔ ایسے کردار جو اپنے طبقے، اپنے گروہ یا اپنے اندازِ نظر کے نمائندے کہے جا سکیں۔

۲۔ جن میں روایتوں کا تسلسل مقید ہو۔

۳۔ جن میں صدیوں کی صداقت بند ہو۔

۴۔ جن کا نام زبان پر آتے ہی خیالات کا وہ افسوں جاگ اٹھے جو کردار کی جیتی جاگتی دنیا اور اس کی زندگی کے ماحول میں پہنچا دے۔

یہ چند خصوصیات ہیں جو احتشام حسین نے زندۂ جاوید کردار کے متعلق بیان کی ہیں۔ ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ کردار حقیقت نگاری کے اصولوں پر کھرا اُترے۔ البتہ اس میں چند یا ایک خصوصیت ایسی ضرور ہو کہ وہ اس عہد کا مجسمہ بن جائے جس میں وہ سانس لے رہا ہے۔ اُردو ناول کے چند کردار جن کی احتشام حسین نے نشاندہی کی ہے ان میں سب سے پہلے نذیر احمد کے ناولوں کے کردار ہیں مثلاً مرزا ظاہر دار بیگ، کلیم، نصوح اور ابن الوقت۔ ان کرداروں کو تاریخی اور نیم تاریخی کے ضمن میں احتشام حسین نے پیش کیا ہے۔

اُردو ناول کے کرداروں میں ان کے نزدیک ''خوجی'' کا مرتبہ بلند ہے۔ احتشام حسین خوجی کو اُردو ناول کا ایک زندۂ جاوید کردار مانتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ احتشام حسین نے اس کردار کے حوالے سے پورا مضمون لکھ ڈالا۔ اس مضمون سے قبل غالباً کسی نقاد نے کردار کو موضوع بنا کر اس کے سماجی شعور پر بحث نہیں کی اور نہ ہی کسی کردار پر باقاعدگی سے تنقید کی۔ یہ مضمون اس لیے اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ یہ ایک ایسے کردار پر مبنی ہے جو نئی اور پرانی تہذیب کے درمیان جنم لیتا ہے اور ایسے معاشرے کو پیش کرتا ہے جو زوال کے تذبذب و کش مکش اور بے ہنگمی کی عکاسی کرتا ہے۔ یوسف سرمست نے انھیں یکرخہ کردار کہا ہے۔ 'فسانۂ آزاد' کی کردار نگاری کے مطابق وہ لکھتے ہیں:

> ''سرشار کی کردار نگاری کا امتیاز ان کے یکرخے (Flat) کردار

پیش کرنے میں مضمر ہے۔''

احتشام حسین 'خوجی' کو لافانی کردار تسلیم کرتے ہیں اور اس بات کا برملا اظہار کرتے ہیں کہ خوجی ''فسانۂ آزاد'' کے ماحول میں پیدا ہوسکتا تھا۔

''وہ (خوجی) اپنی ساری خصوصیات کے ساتھ سرشار ہی کے ذہن میں جنم لے سکتا تھا۔ کیونکہ ادبی اور فنی حیثیت سے اس عہد اور ماحول نے سرشار سے بڑا کوئی مبصر پیدا نہیں کیا۔''

سرشار کا ذہن دراصل نیم رومانی اور نیم حقیقی ہے۔ انھوں نے فسانۂ آزاد میں حقیقی اور غیر حقیقی دنیا کا امتزاج پیش کیا ہے۔ ناول میں سیکڑوں کردار پانی کے بلبلوں کی مانند اُبھرتے ہیں پھر ختم ہوجاتے ہیں۔ قصّہ بظاہر عشقیہ ہے البتہ افسانہ در افسانہ اور غیر ضروری تفصیلات نے پلاٹ کو پیچیدہ کردیا ہے۔ کہانی کے دو اہم کردار ہیں آزاد اور خوجی، آزاد جو کہ قصہ میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے، اس کے باوجود خوجی پر اس کو فوقیت نہیں دی جاسکتی۔ خوجی ایک لاابالی طبیعت اور شیخی وطرّاری کی وجہ سے قاری کی توجہ حاصل کرلیتا ہے اور قصّے کو دلچسپ بناتا ہے۔ احتشام حسین فسانہ آزاد میں خوجی کی اہمیت واضح کرتے ہوئے خوجی کے متعلق لکھتے ہیں:

''اس میں بظاہر خوجی کی کوئی جگہ نہیں لیکن اگر اس کو نکال دیا جائے تو داستان بالکل مردہ اور ناقابلِ یقین رہ جائے گی۔''

سرشار کا یہ قصہ لکھنؤ کی فضا میں لکھا گیا ہے اس کے علاوہ اس میں بمبئی، اسکندریہ اور ترکی وغیرہ کا بھی ذکر ہے۔ یہ قصّہ اس وقت کا ہے جب اودھ کی تہذیب کا زوال ہورہا تھا۔ عوام میں ایک قسم کا تذبذب وتزلزل تھا۔ معاشرتی نظام بے ترتیبی کا شکار تھا۔ اودھ کی سماجی اور معاشی زندگی ہی دراصل اس ناول کو وجود میں لانے کا محرّک بنی چنانچہ احتشام حسین لکھتے ہیں:

''وقت وہ تھا جب پرانی دنیا ختم ہورہی تھی اور نئی دنیا جنم لینا چاہتی تھی، سرشار دونوں کے درمیان کھڑے ہوئے اپنی ذہانت سے دونوں پر تنقید کررہے تھے۔''

فسانۂ آزاد کی کہانی میں نہ ہی کوئی ربط وتسلسل ہے اور نہ ہی کوئی منصوبہ بند قصّہ۔ ایسی صورت میں کہانی کے درمیان ''خوجی'' کا وجود اور اس کی نفسیات بالکل فطری معلوم ہوتی ہے۔ احتشام حسین لکھتے ہیں:

''خیال ہوتا ہے کہ اگر کوئی باقاعدہ پلاٹ ہوتا، کوئی بنیادی خیال ہوتا تو خوجی وہ نہ ہوتا جو آج ہمیں ملا ہے۔ وہ اسی بے ترتیبی اور عدم تسلسل کا نتیجہ ہے جو سنجیدہ ہوکر فسانۂ آزاد کو اعلیٰ ناول نگاری کے اصولوں پر غور کرنے سے باز رکھتے ہیں۔''

احتشام حسین کے نزدیک خوجی نے فسانۂ آزاد کی خامیوں پر اپنی شیخی اور لاابالی پن سے پردہ ڈال دیا حالانکہ عمل میں انتہائی ڈرامائی کیفیت کے باوجود حرکت نہیں معلوم ہوتی، لیکن خوجی کی موجودگی اس قصّے کو زندہ انسانوں کی دنیا بناتی ہے۔

بلاشبہ ''فسانۂ آزاد'' کردار نگاری کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہے، اس قصّے کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرشار کو کردار نگاری میں مہارت حاصل ہے وہ ماہر فن کار کی طرح کردار کو تراشتے چلے جاتے ہیں جو اپنے دور کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ نذیر احمد نے بھی مثالی کردار پیش کیے ہیں لیکن خوجی کی شکل میں جیسا کردار آزاد نے پیش کیا ہے اس کی مثالیں اُردو ادب میں بہت کم ملتی ہیں۔

فسانۂ آزاد کے حوالے سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سرشار بہترین انشا پرداز ہیں، احتشام حسین نے بھی ان کی انشا نگاری کا اعتراف کیا ہے کہ اس کے مقبول ہونے کی وجہ بھی یہی بتائی ہے۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

''اس کہانی کے مقبول ہوجانے کی اصل وجہ سرشار کی غیر معمولی انشائی صلاحیت ہے۔ وہ ایک جادوگر ہیں جن کی جھولی میں ہر طرح کے سامان ہیں۔ زبان کے ایسے ماہر اور اندازِ بیان پر ایسی قدرت رکھنے والے ادب میں شاذ ہی پیدا ہوتے ہیں۔''

بہرحال مجموعی طور پر اگر جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ یہ کہانی اُردو ناول میں اضافے کی چیز ہے۔ احتشام حسین اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''سرشار کی عظمت کی ایک اہم کسوٹی یہ ہے کہ ان کے ناول پڑھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہندوستان کے ایک مخصوص علاقہ اور ایک مخصوص دور کی زندگی کے متعلق اس کی معلومات، بصیرت اور پرکھ کی قوت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا اور یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ اس نے ادب کے رنگا رنگ اور متنوع باغوں اور چمنستانوں کی سیر نہیں کی۔''

نذیر احمد اور رتن ناتھ سرشار کے بعد احتشام حسین نے عبدالحلیم شرر کے ناولوں کا تجزیہ کیا ہے۔ شرر کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''وہ اس اسلامی نشاۃ ثانیہ کے ترجمان اور مبلغ ہیں جس کے جنم دینے میں سرسید، نذیر احمد، چراغ علی اور شبلی پیش پیش تھے۔ یہ حضرات محض ان کی سیاسی، معاشی اور سماجی حالات کے آلۂ کار تھے جو غدر کے بعد ہندوستان میں رونما ہوئے۔''

شرر کے تاریخی ناولوں کے سلسلے میں احتشام حسین کی رائے مثبت نہیں ہے۔ انھیں شرر کے ناولوں میں مقصدیت کی واضح صورت نظر نہیں آتی۔ ان کے نزدیک شرر کے ناولوں کی سطح نذیر احمد اور سرشار سے پست تھی البتہ اندازِ بیان اور پلاٹ نے ان کے ناولوں کو قابلِ قدر بنادیا ہے۔ عبدالحلیم شرر نے اپنے ناولوں کا پلاٹ انگریزی ناولوں کے طرز پر رکھا جس سے کہانیوں کا اندازِ بیان بہتر ہوا۔ ان کے اصلاحی ناول بھی احتشام حسین کے نزدیک زیادہ اہم نہیں البتہ موضوعات کے لحاظ سے عام وقت کے تقاضوں اور اصلاحی اندازِ

نظر پیش کرتے ہیں۔

شرر کے ناولوں کی سطح نسبتاً پست ہونے کے باوجود ان کے زبان و بیان اور موضوع نے ان کے ناولوں کو ہر دلعزیز بنادیا۔ شرر کے ناول زیادہ تر مسلمانوں کی قدیم تاریخ پر مبنی ہیں۔ ان کے تاریخی ناولوں کے سلسلے میں احتشام حسین کا خیال ہے کہ:

''شرر اپنے طور پر ناولوں کے ذریعے وہی کام انجام دینا چاہتے تھے جو دوسرے اپنی تاریخی کتابوں، علمی مضامین اور مذہبی مباحث سے انجام دے رہے تھے۔''

نتیجتاً احتشام حسین لکھتے ہیں کہ شرر خوابوں کے ترجمان ہیں۔ ایسا اس صورت میں ہوتا ہے جب حقائق تک دسترس نہ ہو۔ انسان اپنے ماضی یا مستقبل میں پہنچ کر لطف انگیز ہوتا ہے۔

تاریخی ناول کے سلسلے میں احتشام حسین نے محمد علی طبیب کا بھی ذکر کیا ہے جن کے ناول شرر کے جواب میں لکھے گئے۔ طبیب کے ناول ادب میں اپنا کوئی گہرا اثر نہیں چھوڑتے۔ احتشام حسین لکھتے ہیں:

''مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا سماجی شعور گہرا نہ تھا۔ اسی لیے ان کے ناول کسی حیثیت سے کوئی دیرپا اثر نہیں چھوڑتے، نہ ان کے ناول پڑھ کر زندگی کا کوئی راز منکشف ہوتا ہے۔''

نذیر احمد اور سرشار کی تخلیقات کے بعد احتشام حسین مرزا ہادی رسوا کے شاہ کار ناول امراؤ جان سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اس ناول میں انھیں سماجی شعور بھی نظر آتا ہے اور مقصدیت جس کی تلاش ہر ترقی پسند ناقد کرتا ہے۔

مرزا ہادی رسوا کا یہ ناول اس لیے بھی اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ اس ناول کے ذریعہ رسوا نے ایک ایسی عورت کو پیش کیا جو معاشرے کے ایسے طبقے سے تعلق رکھتی تھی جسے باعزت نہیں سمجھا جاتا تھا۔ نذیر احمد نے بھی عورتوں کے کردار کو پیش کیا جو مثالی تھے۔ یہ کردار اصلاحی غرض سے مفید ہو سکتے تھے لیکن حقیقی معاشرے کی تفہیم کے لیے اس حد تک کارگر نہیں ہو سکتے تھے جتنا کہ رسوا کی امراؤ جان۔ اردو کے لیے یہ ایک اہم بات ہے کہ اس کی ابتدا سے ہی عورتوں کے کردار کو مثالی صورت میں پیش کیا گیا۔ جبکہ اس وقت سماج میں عورتوں کی حیثیت متعین نہیں ہوئی تھی۔ احتشام حسین امراؤ جان ادا کے متعلق رقمطراز ہیں:

''ادب میں ابھی باقاعدہ عورت ہی کا سماجی مقام متعین نہیں ہوا تھا جب کہ ایک طوائف کا ہمدردانہ ذکر۔ رسوا نے یہ ناول لکھ کر ادبی موضوعات کو وسعت دی۔''

سماجی نقطۂ نظر سے اگر اس ناول کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ یہ ناول اودھ کی زوال آمادہ تہذیب کی عکاسی کرتی ہے۔ لکھنؤ کا ماحول، غدر کا ہنگام اور عوام کے درمیان اس کی کش مکش یہ تمام چیزیں اس ناول میں نظر آتی ہیں:

''رسوا نے بھی سماج کے ارتقا یا تغیر کے بنیادی مسائل سے بحث نہیں کی لیکن پھر بھی ان کے مطالعہ سے ہمارے شعور کی راہیں روشن ہوتی ہیں اور ہم بعض مسائل پہلے سے زیادہ بہتر طریقے سے سمجھنے لگتے ہیں۔''

آگے چل کر احتشام حسین سماجی شعور کی تلاش رومانی تحریک کے زیر اثر لکھے گئے ناولوں میں کرتے ہیں۔ ان ناول نگاروں میں سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری اہم ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے مرزا محمد کا بھی ذکر کیا ہے۔ رومانیت کے متعلق وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''رومانیت اس وقت کی فضا اور ماحول کا ایک عام جز ہے اور ادب کے ہر شعبہ میں اس کا عکس ملتا ہے یہ محض قدیم نسل سے نئی نسل کی تخیلی اور ذہنی بغاوت نہیں تھی بلکہ خیالوں کی مدد سے ایک آسودہ حال، مکمل رنگین اور نشاط آوار دنیا بنانے کی کوشش تھی۔''

سجاد حیدر یلدرم کے ناول ''لندن کی ایک رات'' میں احتشام حسین کو اشتراکیت اور مارکسی نظریہ کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ اس ناول میں نہ ہی محنت کش طبقہ ہے اور نہ وہ طبقاتی کش مکش جو ترقی پسندوں کے یہاں موجود ہے۔ اس کہانی میں اصلاحی فکر زندگی کے نئے امکانات کے یقین، مغربی اثرات اور آزادی کی خواہش، یہ تمام چیزیں جہاں کرداروں کو عمل پر اکساتی ہیں وہیں ان کی فکر کو بھی مہمیز کرتی ہیں۔ اس ناول کے کردار سماجی قید و بند توڑنے، نئی راہوں پر چل نکلنے اور تخیل کے ذریعہ اپنی خواہشات کی تکمیل پر آمادہ ہوتے ہیں، یہ نفسیاتی صورتِ حال دراصل متوسط طبقے کے شعور کی نمائندگی کرتی ہے۔ ''سب کے سب اس متوسط طبقہ کے نمائندے ہیں جو گرتی ہوئی دیوار کی طرح کسی سہارے کا منتظر ہے۔ بعض یہ سمجھتے ہیں کہ اوپر کے طبقے سے مل جانے میں ان کی نجات ہے اور بعض یہ خیال کرتے ہیں کہ محنت کرنے والے طبقہ کا ساتھ دینا ہی ان کا اصل مقصد ہے۔'' مجموعی طور پر اس ناول کے متعلق احتشام حسین کا نقطۂ نظر ہے:

''سجاد ظہیر کے ناول کے کردار اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جسے سجاد ظہیر اچھی طرح جانتے ہیں لیکن یہ کردار مردہ اور بے جان نہیں ہیں۔ ان میں زندگی کو سمجھنے اور جاننے کی پیاس ہے اس لیے ان کے تجزیہ میں زندگی کو مکمل طور پر اس کے ہر پہلو کو پیش کرنا پڑتا ہے، معاشیات، سیاسیات، ادب اور آرٹ، جنسیات سب کا ذکر اس مختصر ناول میں آجاتا ہے۔''

رومانی تحریک کے بعد ہندوستانی ادب میں ایک بڑا انقلاب ترقی پسند تحریک کی صورت میں رونما ہوا۔ یہ انقلاب مغربی تحریکوں سے متاثر اور

مارکس کے خیالات کا پرچم بردار تھا۔اس کے زیرِ اثر لکھنے والوں نے سماج کے دبے کچلے افراد کو کہانیوں کا موضوع بنا کر جاگیرداری اور سرمایہ داری کے خلاف احتجاج کیا۔ان کا بنیادی مقصد ادب کو زندگی کے روبرو کرنا اور حیاتِ انسانی کو ادب میں پیش کرنا تھا۔البتہ وہ ایسے انسانوں کو ترجیح دیتے جسے سماج نے قدر کی نظر سے نہ دیکھا۔ بلاشبہ ترقی پسندوں نے ناول اور دیگر افسانوی ادب کے موضوعات میں وسعت پیدا کی اور اسے حقیقت سے بے حد قریب کر دیا۔

اس ضمن میں جو نام سرِ فہرست ہے وہ پریم چند کا ہے۔ پریم چند کے ابتدائی ناولوں میں سماجی شعور وہ نہ تھا جو ان کے بعد کے ناولوں میں نظر آتا ہے۔ البتہ ابتدا سے ہی انھوں نے زمینی موضوعات پیش کیے اور حسن کے معیار کو تبدیل کر کے مزدور اور دبے کچلے افراد کی کریہہ حقیقتوں کو کہانیوں میں پیش کیا۔احتشام حسین پریم چند کے ناولوں میں دو قسم کی حقیقتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جب حقیقت لفظ کا استعمال کرتا ہوں تو میرے سامنے انسان کی مادی زندگی کے دو پہلو ہوتے ہیں جو مخصوص قسم کے معاشی نظام کے سبب وجود میں آتے ہیں اور ان کو بدلنے یا برقرار رکھنے کے لیے مختلف طبقات جدوجہد کرتے رہتے ہیں۔ پریم چند کا مطالعہ اسی حقیقت اور احساس فن کی روشنی میں ہوسکتا ہے۔''

پریم چند کے ناولوں میں پہلی دفعہ دیہی زندگی اور اس کے مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ان کے کردار، ماحول، کہانی سب کے سب ایک ایسے طبقے کے نمائندہ نظر آتے ہیں جو اس سے قبل ناول میں نہیں تھا۔ پریم چند کے اس امتیاز کو سراہتے ہوئے احتشام حسین رقمطراز ہیں:

''انھوں ہی نے پہلی دفعہ معمولی میں غیر معمولی اور خاموشی میں اضطراب کی جستجو کی، انھوں نے عام انسانوں کو بھی سمجھا اور ان کے دلوں میں جھانک کر دیکھا تو وہاں بھی آرزوؤں اور تمناؤں، خیالوں اور خوابوں، غموں اور خوشیوں کی ایک آباد دنیا دکھائی دی۔ انھوں نے ان جذبات کے محرکات بھی تلاش کیے۔''

پریم چند کے ناولوں کو پڑھ کر بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی مشینی انداز میں اپنے تمام پہلوؤں کے ساتھ حرکت کر رہی ہے۔ کہانیاں شعور کی گہرائی کے ساتھ، انسان کو مختلف حالات میں سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔ احتشام حسین کے نزدیک ''میدانِ عمل'' اور ''گئودان'' نہ صرف پریم چند کے فکر وفن کے بلکہ زندگی کے بہترین عکاس ہیں۔البتہ گئودان کے متعلق وہ اس بات کا اقرار بھی کرتے ہیں کہ گئودان میں کئی جگہ مابعد الطبیعیاتی اور روحانی قسم کی محبت کا ذکر ہے۔اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ پریم چند پوری طرح سے مارکسیت سے واقف نہیں تھے اور ناول میں جن لوگوں کا ذکر ہوا ہے ان کی زندگی میں یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں تھی۔ احتشام حسین پریم چند کے ناولوں میں مارکسزم کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پریم چند کے لیے یہ کچھ کم قابلِ تعریف نہیں ہے کہ انھوں نے زندہ مرد اور عورت، ہندوستانی معاشرت کی بیقرار فضا اور طبقوں کے مفاد کی ٹکّر اس خوبی سے پیش کی ہے۔اس لیے مارکسزم کے اثر کا ایک پہلو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ غیر شعوری طور پر سوسائٹی کے الجھاؤ کو اس طرح سمجھا جائے جس طرح مارکس کے مطالعہ کے بعد سمجھا جاسکتا ہے۔''

پریم چند کے ناولوں کا مختصر جائزہ لینے کے بعد احتشام حسین ان کے بعد کے ناول نگاروں کا ذکر بھی کرتے ہیں جن میں تحلیلِ مارکسیت نظر آتی ہے۔اس ضمن میں انھوں نے عصمت چغتائی، کرشن چندر کا ذکر علی الترتیب ''ضدی'' اور ''شکست'' کے حوالے سے کیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ موضوع کے لحاظ سے مارکسی نقطۂ نظر کا ترجمان تو نہیں کہا جاسکتا۔البتہ کچھ ایسے پہلو نظر آتے ہیں جن کی بنیاد پر زندگی کے مسائل کی تصویر کشی کی جاسکتی ہے۔ضدی کے متعلق احتشام حسین لکھتے ہیں:

''ضدی کا مجموعی اثر وہی پڑتا ہے جو اصلاحی کہانیوں کا ہونا چاہیے لیکن جگہ جگہ پر پورن کی غریب دیہاتی محبوبہ کی احساسِ غربت و کمتری اس بات کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے کہ کس طرح خارجی حقیقتیں داخلی تصورات پر اثر انداز ہوتی ہیں۔''

کرشن چندر کے ناول ''شکست'' کے متعلق ان کا خیال ہے کہ یہ رومانی لہجے میں لکھا ہوا ناول ہے مگر اس میں کشمیر کی سماجی حالت کے جن مسائل اور زندگی کی جن حقیقتوں کو پیش کیا گیا ہے، وہ اہم ہے۔ رومانیت کے باوجود اس کی حقیقتیں قاری کو واضح طور پر نظر آتی ہیں۔

''ناول کی منزلیں خود زندگی کے ایک سائنٹفک تصور کا پتہ دیتی ہیں۔خیال ہے، عمل ہے اور پھر تصادم ہے اس عمل اور تصادم میں زندگی عریاں اور رقصاں دکھائی دیتی ہے۔''

مجموعی طور پر احتشام حسین کا موقف یہ ہے کہ ناول ادب کی بہترین صنف ہے جس میں زندگی کے حقائق کو بہتر طریقے سے پیش کیا جاسکتا ہے اور جس سے زندگی کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔کہانیوں میں ان کی تلاش ہر وہ زاویہ حیات ہے جو سماجی شعور اور معاشرے کے کسی اہم پہلو کو پیش کرتا ہے۔ انھوں نے اس بات کا بھی اعتراف کیا ہے کہ نظریات اور خیالات کسی بھی لحاظ سے کہانیوں میں پیش کیے جائیں اصل موضوع تو بہر حال انسان ہی رہتا ہے۔انسان کی اجتماعی وانفرادی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو ہی کہانیاں کسی نہ کسی صورت میں پیش کرتی ہیں۔

○○